محمد سلیم ملک

اردو اصوات اور املا کی تدریس، امریکہ میں

اَمریکہ میں اردو تدریس کو گونا گوں مشکلات کا سامنا ہے، البتہ اردو سیکھنے والوں میں یہ قدرِ مشترک نظر آتی ہے کہ وہ انگریزی زبان سے آشنا ہوتے ہیں۔ اُدھر لِسانیات کے عالموں نے زبانوں کے زُمرے بنائے تو اردو اور انگریزی کو ایک خاندان میں رکھا، یعنی انہیں آریائی خاندان کی اراکین قرار دیا، جس سے اردو کے طالب علموں کو وہ آسانیاں اپنے آپ فراہم ہو گئیں جو ہم رشتہ زبانوں کی نِہاد میں مضمر ہوتی ہیں۔ اُن خصائص کا ذکر یہاں شاید بے محل ٹھہرے، اِس لیے ہمارا نقطۂ ماسکہ صِرف وہ تخالُف رہے گا جو اردو فہمی کے باب میں انگریزی آشنا طالب علموں کو نامانوس دِکھتا ہے۔

زبان نوعِ اِنسانی کی غیر مرئی تخلیق ہے، جو تکلّم سے آفرینش پاتی اور سماعت پر انجام پذیر ہوتی ہے۔ یہ اپنا تانا بانا آوازوں سے بُنتی ہے، اِس لیے اردو تدریس کا پہلا مرحلہ بلاشبہ اَصوات سے شروع ہوتا ہے، جس کے لیے اردو کے مُصوّتوں اور مُصمّتوں (vowels and consonants) کا ذکر ناگزیر ہے، مگر یہاں اردو کی فرومائیگی کا اعتراف کرنا کتنا دل گداز ہے کہ اِس کا کوئی ایسا محتاط مطالعہ ابھی تک سامنے نہیں آسکا، جس میں اردو زبان کے تمام مصوتوں اور مصمتوں کی نِشان دہی کی گئی ہو۔ یہاں تک کہ ہم اردو کے صوتیوں (phonemes) کی صحیح تعداد بتانے سے بھی قاصِر ہیں۔ اِس کے لیے ضرور ہے کہ اردو بولنے والوں کے کسی خاص علاقے کی زبان کا مطالعہ اِس طرح کیا جائے کہ اردو کی تمام آوازیں صَدا بند ہوں۔ مصمتوں اور اُن کے خوشوں کے ساتھ ساتھ مصوتوں، نیم مصوتوں اور دُہرے اور تہرے مصوتوں کا سراغ لگا کر حتمی نِشان دہی کی جائے، تاکہ اردو اِملا کی معیاری تسوید کی داغ بیل پڑ سکے۔

ماجرا یہ ہے کہ زبان میں بولا ہوا لفظ مُقدّم رہتا ہے۔ لکھا ہوا لفظ مُؤخر ہوتا ہے۔ اصوات کی ادائیگی اور اُن کی سَمعی شناخت قدرِ اول کا درجہ رکھتی ہیں۔ اِملائی حروف کی پہچان اور اُن کی ترقیم، بعد کے مراحل ہیں، مگر اِسے کیا کیجے کہ دوسری زبانوں کے متوازی، اردو تدریس بھی لکھے حرفوں سے شروع ہوتی ہے اور طالب علم کے لیے سرچشمۂ ہدایت بنتی ہے، یعنی مبتدی کو چھپے حرفوں کا قاعدہ پہلے پکڑاتے ہیں اور اُن کی آوازیں بعد میں

سکھاتے ہیں، یوں کہیں کہ بگھی آگے رکھتے ہیں اور گھوڑا پیچھے باندھتے ہیں۔ ماہرینِ تعلیم کی یہ الٹی گنگا اُس وقت تک بہتی رہے گی جب تک آواز کو حرف پر برتری حاصل نہیں ہوتی، اور تقریر و تحریر کا کوئی بہتر طریق وضع نہیں ہوتا، اِس لیے ہم بھی یہاں ہر چہ باداباد کے مصداق اردو کے الف بائی نظام کا ذکر پہلے کرتے ہیں اور صوتیات کی طرف توجہ بعد میں منعطف کریں گے تاکہ ڈور کا سرا کہیں سے گرفت میں آجائے۔

کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں، آرامی زبان کی ترقیم کے لیے، چھے اراکین تشکیل دیے گئے: اَبجد، ہوز، حُطی، کلمن، سَعفص، قَرشت۔ یہ ارکان جب عربوں نے اپنائے تو اُنہوں نے عربی کی چھے آوازیں اُن میں شامل کر دیں، جس سے دور کن اور متعارف ہوئے، یعنی ثخذ اور ضَظغ، بعدازاں، یہ آٹھ کلمات فارسی کے عالموں کے پاس پہنچے تو اُن کے پاس فارسی کی کچھ جداگانہ آوازیں تھیں، انہیں عربی حروف میں اِس طرح شامل کیا کہ کسی آواز کے لیے نئی علامت وضع نہ کی۔ ''ث'' کے تین نقطے، بہ طور نمونہ، سامنے رکھے اور پرانی علامتوں میں تین تین نقطے لگا دیے۔ اِس طرح فارسی کی ''پ''، ''چ''، ''ژ'' کی علامتیں وجود میں آئیں، بعدازاں، یہی املا جنوبی ایشیا میں اردو کی لکھائی کے لیے مُستعمل ہوئی تو یہاں کچھ نئی آوازوں سے واسطہ پڑا جو نہ آرامی میں تھیں، نہ عربی میں اور نہ فارسی میں۔ انہیں املا کے ظرف میں ڈالتے ہوئے وہی احتیاط کی گئی کہ کوئی نئی علامت وضع نہ ہو، تاکہ مبتدی کے حافظے پر نئی علامتوں کا بوجھ نہ پڑے۔ فارسی والوں نے تین تین نقطے لگائے تھے۔ اب اردو والوں کی باری آئی تو انہوں نے چار چار نقطے لگا دیے۔ سندھی زبان نے اپنی املا میں چار نقطوں کی یہ رَوش برقرار رکھی، مگر اردو کے علما نقطوں کی ریل پیل سے اُکتا گئے، اس لیے کچھ عرصے بعد چار نقطوں کی جگہ ''۴'' کا ہندسہ لکھنے لگے۔ اِس سے حروف میں کفایت تو پیدا ہوئی مگر ایک نئی اُلجھن پیدا ہوگئی کہ حرفوں میں ہندسوں کا اِختلاط بعضوں کے ذوق پر گراں گزرنے لگا، جس کا حل یہ نکالا گیا کہ ''چار'' کا ہندسہ لکھنا ترک کیا اور اُس کے بجائے اُن حروف پر ننھی سی ''ط'' ثبت کرنے لگے، لہٰذا جنوبی ایشیا کی ہندی الاصل اَصوات ''ٹ''، ''ڈ''، ''ڑ'' کی علامتوں میں ظاہر ہوئیں۔ اِس دوران میں اَبجد، ہوز، حطی وغیرہ کے ارکان کھول کر ہم شکل حروف ساتھ ساتھ رکھ دیے گئے تاکہ علامتوں کی پہچان میں تسہیل ہو اور املا کی مشق بہ خوبی ہو سکے؛ جیسے ''ب''، ''پ''، ''ت''، ''ٹ''، ''ث''؛ ''ج''، ''چ''، ''ح''، ''خ''؛ ''د''، ''ڈ''، ''ذ''... اِس تمہید کا مقصود یہ بتانا تھا کہ اردو نے املا کا یہ آمیختہ توارُث میں پایا، جس کے بطن سے طرح طرح کے مباحث جنم لیتے ہیں۔

اب صورت یہ بنی کہ ہندی سے آئی ہوئی مَلفوفی یا پلٹے دار آوازوں (retroflex sounds)، یعنی ''ٹ''، ''ڈ''، ''ڑ'' میں سے ''ٹ'' اور ''ڈ'' تو انگریزی میں سنائی دیتی ہیں، لیکن ''ڑ'' نہیں بولی جاتی، اِس لیے

’’ژ‘‘ کی تربیت لازمی ہے۔عربی کی کئی اَصوات،جنوبی ایشیا کی زبانوں میں تکلم آشنا نہ ہوسکیں، حالاں کہ مالابار کے ساحل پر عرب ملاحوں کی بستیاں قدیم زمانے سے چلی آتی تھیں اور آٹھویں صدی کے اوائل میں سندھ پر عربوں کی براہِ راست حکومت قائم ہو چکی تھی، اِس کے باوجود عربی کی ساری آوازیں یہاں کی بولیوں میں دَخیل نہ ہوسکیں، البتہ عربی رسم الخط، فارسی حروف کے ایزاد سے، اپنی لکھی ہوئی شکل میں، یہاں متعارف ہوا، اِس لیے ’’ث‘‘، ’’ح‘‘، ’’ذ‘‘، ’’ص‘‘، ’’ض‘‘، ’’ط‘‘، ’’ظ‘‘، ’’ع‘‘، ’’ق‘‘، ’’ء‘‘ نے اردو املا میں اپنا وجود برقرار رکھا، یہی وجہ ہے کہ ہمارا املائی نظام آج بھی اردو اصوات سے کسی قدر بے گانہ لگتا ہے اور آئے دن اِس طرح کے مباحث جنم لیتے ہیں کہ جو آواز ہم بولتے نہیں، اُسے لکھتے کیوں ہیں؟ کیوں کہ ہم ’’س‘‘، ’’ص‘‘ اور ’’ث‘‘ کو تبرکاً لکھتے ہیں، مگر بولتے صرف ’’س‘‘ ہیں۔اِن میں سے ’’ث‘‘ کی عربی صوت، یونانی کے تھیٹا کے مُشابہ ہے، جسے انگریزی کی (th) کے مُتبادل سمجھا جاتا ہے، اِسی طرح ’’ت‘‘ اور ’’ط‘‘ کو صرف ’’ت‘‘ سے بولتے ہیں۔اردو اِملا میں یہ اصراف ’’ز‘‘، ’’ذ‘‘، ’’ض‘‘ اور ’’ظ‘‘ کی علامتوں مین زیادہ نظر آتا ہے، جن میں سے صرف ’’ز‘‘ کی صوت ہماری نطق سے ٹکراتی ہے۔ان عربی الاصل اصوات کو صحیح مخارج سے نہ بولنے میں ہماری جغرافیائی، ماحولیاتی اور بشریاتی تحدیدات جو بھی رہی ہوں، مگر یہ اعتراف کر لینے میں کیا ہرج ہے کہ اردو کے مبتدی طالب علم کو ان عربی اصوات کی صحیح ادائیگی سے واسطہ نہیں پڑتا، اور انھیں صحیح مخارج سے ادا کیے بغیر وہ اردو بول چال پر قدرت حاصل کر سکتا ہے ۔یہی صورت ہائے حطی (ح) اور ہائے ہوز (ہ) کی ہے کہ بعض اہل علم جب احتیاط اور اہتمام سے ہم کلام ہوتے ہیں تو ان کی آواز میں اس کا خفیف سا فرق سنائی دیتا ہے، اسی طرح ’’ا‘‘، ’’ع‘‘ اور ’’ء‘‘ عربی میں اپنے مخارج (articulations) کے اعتبار سے جتنے دور دور واقع ہوئے ہوں اور اردو بولنے والے، قرآن مجید کے قاری حضرات، ان اصوات کو جس قدر اہتمام سے بولیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ اردو کا عام بولنے والا انہیں بولتے ہوئے زیادہ فرق نہیں کرتا، جس سے اردو سیکھنے والوں کے لیے آسانی کی راہ نکلتی ہے، مگر طرفہ یہ ہے کہ ان اجنبی آوازوں کی علامتیں ہمارے املائی نظام کا ناگزیر حصّہ بن چکی ہیں، اس لیے اردو لکھتے ہوئے ان علامتوں سے مفر کی کوئی صورت نہیں۔

ہمزہ، عربی کی مستقل صوت ہے، مگر اردو میں عموماً علامت یا نشانی بن جاتی ہے۔ہمزے کو بیٹھنے کے لیے بالعموم الف کی مسند چاہیے۔عربی میں کسی لفظ کے شروع میں ہمزہ آئے اور وہی لفظ اردو میں لکھیں تو وہاں ہمزہ نہیں لگاتے، البتہ اس کی چوکی، یعنی الف، برقرار رکھتے ہیں، مگر ہمزہ، لفظ کے بیچ میں آئے تو اسے اردو میں درج کرتے ہیں؛ جیسے، مسئلہ، مسائل، حمائل، شمائل، تاثر، تاسف، متاثر، موثر۔اسی طرح بعض عربی اسماء

جمع کے صیغے میں لکھیں تو اردو املا، ان کے ختم پر، عربی کی تقلید میں، ہمزے کا اہتمام کرتی ہے: جیسے، انبیاء، اؤلیاء، ادباء، حکماء، شرفاء، شعراء، شرکاء، فصحاء، فقراء، غرباء؛ اسی طرح مرکّب الفاظ میں بھی ہمزہ اپنا وجود برقرار رکھتا ہے؛ جیسے، علاءالدین، بہاءالدین، شفاءالدین، ذکاءالدین، ضیاءالدین، انشاءاللہ، بہاءاللہ، بقاء اللہ، ثناءاللہ۔ اردو املا، ہمزہ لگانے میں اتنی عالی ظرف واقع ہوئی ہے کہ ہندی کے ایسے افعال کے ساتھ بھی عربی نژاد ہمزہ لگانے کو عار نہیں سمجھتی، جن میں دہرے مصوّتے کی صوت سنائی دے؛ جیسے، آؤ، جاؤ، کھاؤ، لاؤ، گاؤ، پاؤ، یا آؤں، جاؤں، کھاؤں، لاؤں، گاؤں، پاؤں، یا آئے، جائے، کھائے، لائے، گائے، پائے، یا آئیں، جائیں، کھائیں، لائیں، گائیں، پائیں۔

املا کے باب میں ایک دل چسپ بحث تشدید کی ہے، جس میں ایک آواز دو بار بولی جاتی ہے۔ صورت اس کی یہ ہے کہ کسی آواز کی تکرار کریں تو اسے پہلی بار ساکن اور دوسری بار متحرک بولتے ہیں اور لطف یہ کہ ہر دو آوازیں توڑ کر دو ارکان (syllables) میں اس طرح پارہ پارہ کرتے ہیں کہ پہلی بار کی آواز پہلے رکن کا آخری حرف بنتی اور ساکن ہو جاتی ہے، جب کہ دوسری بار بولی ہوئی وہی آواز اگلے رکن کا پہلا حرف بنتی اور متحرک ہو جاتی ہے۔ اردو املا میں اس دہری آواز کو دو کے بجائے ایک بار لکھنا مناسب سمجھا گیا، جس کی غایت یقیناً کفایتِ حرفی رہی ہوگی، البتہ اس پر ننھی سی علامت ضرور درج کرتے ہیں، جس کی شکل تین دندانے والی کنگھی (ّ) کی طرح ہوتی ہے۔ اردو دنیا اسے شدّ یا تشدید کے نام سے جانتی ہے؛ جیسے، تبّت (ت بُ، ب تُ)، تیقّن (ت ی قُ، ق نُ)، تلفّظ (ت ل فُ، ف ظُ)، ہمّت (ہ مُ، م تُ)، منّت (م نُ، ن تُ)، امّت (ا مُ، م تُ)، ج نُ، ن تُ)، تکلّف (ت ک لُ، ل فُ)، ترنّم (ت ر نُ، ن مُ)، ۔ اس سے یہ بات صاف ہوگئی کہ تشدید اس وقت لگتی ہے، جب کوئی آواز لفظ کے بیچ میں دہرائی جائے۔ یہ علامت اور اس کا استعمال انگریزی آشنا طالب علموں کے لیے چیزے دیگر ہے، جس کا تعارف اور مشق و ممارست استاد کی خصوصی توجہ مانگتی ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ تشدید کی بحث میں استثنیٰ کی دسیوں مثالیں ملتی ہیں، جیسے کسی لفظ کے شروع میں آواز دو بار بولی جائے تو لکھتے ہوئے نہ اس پر تشدید ڈالتے ہیں اور نہ اسے ایک بار لکھتے ہیں، بلکہ معمول کی عبارت کی طرح دو بار لکھتے ہیں؛ جیسے، ببول (ب، ب، و، ل)، پپوٹا (پ، پ، و، ٹ، ا)، تتلی (ت، ت، ل، ی)، ٹٹول (ٹ، ٹ، و، ل)، سسکی (س، س، ک، ی)، چچا (چ، چ، ا)، گگن (گ، گ، ن)، للکار (ل، ل، ک، ا، ر)، ممکن (م، م، ک، ن)۔ اسی طرح لفظ کے آخر میں ایک ہی آواز دو بار بولی جائے تو اس پر بھی نہ تشدید ڈالتے ہیں اور نہ حرف کو ایک بار لکھتے ہیں، بلکہ اس حرف کو بھی دو بار لکھتے ہیں؛ جسے، سبب (س، ب،

ب)، بگٹٹ (ب،گ،ٹ،ٹ)، مدد (م،د،د)، شرر (ش،ر،ر)، کشش (ک،ش،ش) ، امم (ا،م،م)، ملل (م،ل،ل)۔ اسی طرح اردو افعال میں بھی اگر ایک آواز دو بار بولی جائے تو اگرچہ اردو کی بعض قدیم لغات میں اسے ایک بار لکھ کر اس پر شد لگائی گئی ہے، مگر اب اردو کی مروّج املا یہ ہے کہ اس حرف کو بھی دو بار لکھتے ہیں، جیسے، جننا، جاننا؛ منا، ماننا؛ تننا، تاننا؛ چھننا، چھاننا؛ دھننا، سننا، گننا۔ اسی تسلسل میں یہ بھی مذکور رہے کہ دو ایسے لفظ ساتھ ساتھ آئیں، جن میں پہلا لفظ جس حرف پر ختم ہو دوسرا لفظ اسی حرف سے شروع ہو تو اس پر بھی شد نہیں لگاتے، بلکہ وہ حرف دو بار لکھتے ہیں؛ جیسے، شب برات، ہم مکتب، خوددار، خوش شکل، سررشتہ، کاررواں۔ یاد رہے کہ ضرر رساں میں (ر) تین بار جلوہ گر ہوئی ہے۔

یادش بہ خیر، برسوں پہلے کی بات ہے۔ اگر میرا حافظہ صحیح کام کر رہا ہے تو استاذی مجنوں گورکھ پوری نے ایک روز اردو کی کلاس پڑھاتے ہوئے فرمایا تھا کہ (ق) اصلاً منگولی آواز ہے جو ترکی زبان سے ہوتی ہوئی سامی خاندان میں پہنچی اور عبرانی اور عربی سے گزر کر فارسی اور پھر اردو میں تکلم ریز ہوئی۔ اس سے آگے مجھے یہ کہنے دیں کہ اردو میں (ق) کی حیثیت مستعار (تت سم) آواز کی رہی، کبھی دخیل (تدبھو) آواز نہ بن سکی۔ یہی نہیں بلکہ ایشیا کے جس خطّے میں یہ آواز گئی، اس پر لہجے کی برق ضرور گری۔ اہل ایران نے ''ق'' کو ''غ'' کے قریب کر دیا، اس لیے وہ لکھتے آقا اور بولتے آغا ہیں۔ دکن میں پہنچی تو یہ ''خ'' کی طرح بولی گئی، اس لیے وہاں ''تقریب ہو رہی ہے'' کو ''تخریب ہو رہی ہے'' کہتے ہیں؛ اسی طرح پاکستانی پنجاب میں یہ ''ق''، کلمن کے کاف، یعنی ''ک'' کی شکل میں بولا جاتا ہے، اس لیے وہاں ''قلب'' (بہ معنی دل) کو ''کلب'' (بہ معنی کتا) اور ''قابل'' (بہ معنی سمجھ دار) کو ''کابل'' (بہ معنی افغانستان کا شہر) بولتے ہیں۔ اسی طرح ''ج'' کو ''ز'' میں بدل کر بولنے کا بھی بھارت کے بعض علاقوں میں چلن ہے، جس میں وہ بلاشبہ ''جلیل'' کو تو ''زلیل'' کر دیں گے، لیکن کسی گہرے دوست کا تعارف ان الفاظ میں کرانا ہو کہ یہ میرا جانی دوست ہے تو ''ج'' کو ''ز'' میں بدل کر پتا نہیں کیسے بولتے ہوں گے؟ علاقائی لہجوں کا یہ اختلاف تلفظ میں انتشار کو جنم دیتا ہے، اندریں صورت، یہ ضرورتر ہے کہ کسی معیاری اور مشترک تلفظ پر اہل علم کا اجماع ہو، تاکہ اردو اصوات اپنی ادائیگی میں مرکز گریز نہ رہیں۔

اردو میں واؤ (و) زرخیز آواز ہے، جس کے کئی خصائص لبھاتے ہیں۔ اسے اردو کی روایتی کتابوں میں (w) سے ظاہر کیا جاتا ہے، جو درست نہیں، کیوں کہ جب اسے مصمتے کے طور پر بولیں تو یہ اپنے مخارج کے اعتبار سے لبی دندانی (labio-dental) بن جاتی ہے، جو انگریزی کے (v) کے قریب ہے۔ بعض سنجیدہ علمی کاوشوں میں، جیسے محمد عمر میمن کے علمی تراجم میں اور فرانسس۔ ڈبلیو۔ بریچٹ کے دیوانِ غالب کے ترجمے میں

یہ (V) سے ظاہر کی گئی ہے، البتہ جب یہ مصوتے کے طور پر استعمال ہوتو اسے (W) سے ظاہر کرنے میں تامل نہیں۔ واؤ (و) اردو الفاظ میں لفظ کے شروع میں مصمتے کے طور پر آئے تو متحرک بولی جاتی ہے، جیسے، واجد، وارث، وحید، وقار، ورزش، ورق، وفا، ویران؛ اور لفظ کے بیچ میں آئے تو بھی متحرک رہتی ہے، جیسے، اتوار، باون، ثروت، جانور، دیوار، دیوانہ، رشوت، تلوار، شلوار؛ اور لفظ کے آخر میں آئے تو ساکن ہو جاتی ہے، جیسے جزوْ، عضوْ، محوْ، دیوْ، سروْ، سہوْ، عفوْ، فروْ، لغوْ۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ واؤ مصوتے کے طور پر بھی بولتے ہیں، جیسے پہلے حرف پر پیش ہو اور وہ پیش ظاہر کر کے پڑھا جائے تو واؤ معروف کہلاتی ہے، جیسے دور، طور، نور، طول، مول، خون، جون؛ اور لفظ کے آخر میں بھی آتی ہے، جیسے، بو، جو، خو، سو، کو، مو۔

یہاں تک کہ لفظ کے آخر میں انفیائی صورت بھی اختیار کر لیتی ہے؛ جیسے، چلوں، پھروں، سنوں، سیکھوں، کروں، بھروں، لکھوں، پڑھوں۔ روایتی گرامر میں واؤ کا ایک نام واؤ مجہول ہے، جس میں واؤ سے پہلے حرف پر پیش ہو اور وہ پیش ظاہر کر کے نہ پڑھا جائے تو واؤ مجہول کہلاتی ہے، جیسے اوٹ، اوس، اوجھل، اوڑھو؛ یا پھر لفظ کے بیچ میں اس طرح بولتے ہیں، بول، تول، گول، چور، مور، زور، چوٹ، کھوٹ، نوٹ، اور لفظ کے آخر میں اس طرح آتی ہے: کرو، بھرو، لکھو، پڑھو، چلو، پھرو، کہو، سنو۔ ایک واؤ لین ہے، جس میں واؤ سے پہلے حرف پر زبر ہو اور آواز کو نرم اور ترچھا کر کے بولیں تو واؤ لین کہلاتی ہے، جو لفظ کے بیچ میں اس طرح آتی ہے: موج، فوج، موت، فوت، چوک، کون؛ اور لفظ کے آخر میں اس طرح آتی ہے: جو (ایک غلہ، گندم اور جو)، رو (رفتن سے امر، تیز رو، راہ رو، رو میں ہے رخشِ عمر)، سو (یک صد)، ضو (روشنی، چمک، نور)، لو (شعلہ، امید، کان کا نچلا لوتھڑا)۔ اسی طرح جو واؤ لکھی جائے مگر پڑھی نہ جائے، واؤ معدولہ کہلاتی ہے، جیسے، ''خوش'' لکھ کر اسے ''خش'' پڑھتے ہیں۔ اس کی چند امثال بہ طور نظرے خوش گزرے: خواب (خاب)، خواجہ (خاجہ)، خواص (خاص)، خواہش (خاہش)، خود (خد)، خوراک (خراک)، خورشید (خرشید)، خوشامد (خشامد)۔ ایسی واؤ کے نیچے ثقہ قسم کے ادیب عموماً چھوٹا سا خط کھینچ دیتے ہیں۔ مخدومی ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنا گرامی نامہ جب بھی قلم سے لکھ کر مجھے ارسال فرمایا، اس میں واؤ معدولہ کے نیچے ننھی سی لکیر ضرور کھینچی ہے۔

نون غنہ، اردو کی یکتا آواز ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اردو کے مصمتے بولیں تو سانس کی ہوا منہ سے خارج ہوتی ہے، مگر کچھ مصمتے؛ جیسے ''م'' اور ''ن'' ایسے بھی ہیں جنہیں بولتے سے سانس منہ سے نہیں ناک سے خارج ہوتی ہے۔ ناک کو عربی میں انف کہتے ہیں، اس لیے یہ مصمتے انفی اصوات کہلاتے ہیں، مگر بعض آوازیں اس

طرح بھی ادا ہوتی ہیں کہ سانس کی کچھ مقدار منہ سے خارج ہوتی ہے اور کچھ ناک سے، اس لیے انھیں لسانیات کی اصطلاح میں انفیائی (nasalized) آوازیں کہتے ہیں، جب کہ اردو کی روایتی قواعد انھیں نون غنہ کے نام سے جانتی ہے۔

نون غنہ لفظ کے آخر میں آئے تو اسے لکھتے ہوئے نون کی نیم قوس بنا کر خالی چھوڑتے ہیں۔ اس کے اندر نقطہ نہیں ڈالتے۔ ایسا اندھا نون جہاں نظر آئے، اسے نون غنہ سمجھیں، جیسے، ماں، جواں، کہاں، یہاں، وہاں، نہاں، سماں، گاؤں، جاؤں، پاؤں، کھاؤں، جیسے پچاسوں الفاظ نون غنہ پر ختم ہوتے ہیں۔

نون غنہ مبتدی طالب علم کے ذہن میں تشابہ اس وقت پیدا کرتا ہے، جب یہ کسی لفظ کے بیچ میں آئے۔ یہ بیچ میں آئے تو اسے لکھتے ہوئے نون کا شوشہ بنا کر اس پر نقطہ ڈالتے ہیں، جیسے، بانس، کھانس، پھانس، سانس، بانسری، پھانسی، جھانسا، روہانسا، بھانڈ، کھانڈ۔ دشواری یہ ہے کہ اصلی نون لکھنا ہو تو بھی نون کا شوشہ بنا کر اس پر نقطہ ڈالتے ہیں، جس سے اردو کے نئے طالب علم اس الجھن میں پڑ جاتے ہیں کہ اسے اصلی نون پڑھیں، یا نون غنہ؟ اس مغالطے کو دور کرنے کے لیے بابائے اردو مولوی عبدالحق نے یہ تجویز دی تھی کہ نون غنہ کے نقطے پر الٹی جزم کا نشان بنائیں، جس کی شکل ننھے سے چاند کی طرح ہو۔ اس علامت کی وجہ سے نون غنہ، اصلی نون سے جدا نظر آئے گا۔ بعد میں، جب طالب علم کی مشق بڑھے گی تو وہ لفظ کے بیچ میں آنے والے نون غنہ کو اصلی نون سے اپنے آپ الگ کرے گا۔

انگریزی میں کسی صوتیے کو ہائیہ صورت میں بدل کر بولیں تو اس کا مفہوم نہیں بدلتا، مگر اردو میں کسی آواز کو ہائیہ شکل دیں، یعنی بولتے سمے سانس کی مقدار زیادہ خارج کریں تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کا مفہوم یک سر الٹ جاتا ہے۔ متقابل جوڑے (minimal pairs) تشکیل دیں تو یہ فرق صاف نظر آتا ہے؛ جیسے، (بل، بھل)، (پل، پھل)، (تن، تھن)، (ٹن، ٹھن)، (جل، جھل)، (چل، چھل)، (دم، دھم)، (ڈول، ڈھول)، (بڑ، بڑھ)، (کل، کھل)، (گل، گھل)۔ ان کے معانی میں زمین آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے، اس لیے (بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، ڑھ، کھ، گھ)، جیسی دو چشمی ہائے سے لکھی جانے والی آوازیں اردو صوتیات میں (ب، پ، ت، ٹ، ج، چ، د، ڈ، ڑ، ک، گ) سے متمائز ہو کر صوتیے (phonemes) کے درجے پر فائز ہوتی اور حروف تہجی میں الگ مقام پاتی ہیں، لہٰذا ہائیہ آوازیں بولنے کی جہاں تربیت لازمی ہے، وہاں ان کا مفہوم بھی صراحت سے ذہن نشین رہنا چاہیے۔

انگریزی میں بعض الفاظ کے شروع میں دو یا تین مصمتوں کا جھمکا (consonant cluster) نظر آتا

ہے، جیسے ''سکول'' یا ''سمتھ'' کے شروع میں مصمتے اس طرح جڑے رہتے ہیں کہ بیچ میں کوئی مصوتہ نہیں آ سکتا۔ اردو کا یہ چلن نہیں۔ اردو الفاظ کے شروع میں ایسے جھمکے نہیں ملتے، اس لیے انگریزی زبان کا ایسا جھمکا اردو والوں کے کام و دہن سے ٹکرائے تو وہ ان کے شروع میں خفیف سا صوتیہ (schwa) بڑھاتے ہیں اور اس جھمکے کو توڑ کر دو رکن تشکیل دیتے ہیں، جس سے لفظ میں ایک رکن یا علم عروض کی اصطلاح میں ایک سبب خفیف بڑھ جاتا ہے، یعنی ''سکول'' کو ''اسکول'' (اس، ک ڈل) اور ''سمتھ'' کو ''اسمتھ'' (اس، م تھ) بولتے ہیں۔ اہلِ کراچی کی گفت گو میں یہ سرحرفی صوتیہ، اہل پنجاب کے لیے صوتی تفریح کا باعث بنتا ہے۔ اس خفیف صوتی تصرّف کی وجہ سے انگریزی کے ایسے الفاظ اردو میں مستعار کی حیثیت کھو کر دخیل الفاظ میں شمار ہوتے ہیں۔

علمِ عروض جب اردو شاعری کی تقطیع کرتا ہے تو حروف کے ساکن اور متحرک ہونے کی ترتیب و تواتر شمار کرتا ہے، اور ان سے بننے والے اراکین گن گن کر اپنا حساب چکاتا ہے، جب کہ انگریزی شاعری کی تقطیع کریں تو لفظ کے اراکین میں پائی جانے والی تاکید (stress) شمار میں آتی ہے کہ ہر سطر میں تاکید کی تعداد برابر رہے۔ اس بنیادی فرق کی وجہ سے اردو پڑھاتے ہوئے، انگریزی آشنا طالب علموں کو جہاں وزن کا احساس پیدا کرانا لازمی ہے، وہاں قافیے کے آہنگ اور ردیف کی تکرار کی جانب بھی ان کی توجہ منعطف رہے۔ اس کے لیے اساتذہ کا کلام دل نشیں آوازوں میں صدا بند کریں اور اردو کے طالب علموں کو بار بار سنائیں تو ان کی طبیعت میں موزونیت پیدا ہوگی اور ان پر شعر فہمی کے نئے دریچے کھلیں گے۔

اردو الفاظ کی املائی صورت یہ رہی ہے کہ لکھتے ہوئے ہم ہر لفظ کا چھلا چھلا یا ڈھانچا کھڑا کرتے ہیں، جو رنگ و روغن سے سراسر عاری ہوتا ہے، یعنی تلفظ کی خاطر جن اعراب، علامات یا نقاط کی ضرورت پڑتی ہے، وہ لفظ کے استخواں میں نہیں ٹھونکتے۔ ان کے بغیر لفظ کا ڈھچر کھڑا کرتے ہیں۔ اعراب و نقاط کو لفظ کی حاشیہ آرائی سمجھتے ہیں، اس لیے انھیں درج کرنے میں تجاہل، تغافل یا پھر تساہل سے کام لیتے ہیں۔ اس معاملے میں اردو املا اتنی خوش قامت واقع نہیں ہوئی جتنی ہندی املا ہے، جو دیوناگری لپی میں لکھی جاتی ہے، یا انگریزی زبان ہے، جو رومن رسم الخط میں اظہار پاتی ہے۔ ان رسم ہائے خط میں اعراب و علامات لفظ کے وجود کا لازمی حصہ ہیں، اور جب تک حرکات کی علامتیں درج نہ کر دی جائیں لفظ املائی شکل اختیار نہیں کرتا۔ اردو املا میں بگاڑ کی جو صورتیں نظر آتی ہیں، ان میں سے اکثر اسی املائی تقصیر کا شاخ سانہ ہیں، جو اس کے مزاج میں مضمر ہے۔ اب یہ تو ہونے سے رہا کہ اردو الفاظ کی املائی صورت اس طرح بدل دیں کہ اعراب لفظ کے وجود کا ناگزیر حصہ بن جائیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ زیر، زبر، پیش درج کرنے میں اہل قلم زیادہ ذمہ داری کا مظاہرہ کریں اور کتابیں

چھپنے لگیں تو ان کے حرف چیں، ضمہ، کسرہ، فتح لگانے میں دیدہ ریزی کریں، تاکہ اردو کے غیر ملکی شیدائی جب اس زبان میں شد بد پیدا کریں یا ہمارے بچے اردو کی نوشت وخواند کا درس لیں تو اردو الفاظ روانی اور آسانی سے بولیں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم اردو الفاظ کو بین الاقوامی صوتی رسم الخط (international phonetic alphabets) کی علامتوں میں درج کریں؟ کیا کوئی ماہر صوتیات اردو کی ایسی لغت مرتب کر سکتا ہے جس میں ہر لفظ کے آگے اس کا تلفظ آئی۔ پی۔ اے۔ کی علامتوں میں درج کرے، تاکہ طالب علم جوں ہی لفظ کی املا دیکھے، اس کی آواز کانوں میں گونجنے اور زبان سے ادا ہونے لگے۔

یہ چند معروضات تھیں، جن کی تائید میں امثال بھی راہ پا گئیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اردو اصوات پر سیر حاصل تبصرہ کرنا مقصود تھا نہ پوری املا کا جائزہ لینا ممکن ہے، کیوں کہ اردو رودِ بے کنار کی مانند ہے جس کی غوّاصی کا کون دعویٰ کر سکا ہے! ہزار بادہ نہ خوردہ در رگ تاک است۔ ❑